۱۴

نوجوانوں اور بچوں کی تربیت کا انتظام کیا جائے

(فرمودہ ۱۵؍اپریل ۱۹۳۸ء)

تشہّد ،تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

’’خطبہ جمعہ شروع کرنے سے پہلے میں یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ چونکہ آج جمعہ کی نماز کے بعد ہماری مجلس شوریٰ کا اجلاس ہونے والا ہے اور درمیان میں اس کو ملتوی کرنا کام کیلئے نقصان دِہ ہوتا ہے اِس لئے جمعہ کی نماز کے ساتھ ہی عصر کی نماز بھی انشاءاللہ جمع کی جائے گی۔اس کے بعد میں اپنے گزشتہ خطبات کے سلسلہ میں آج پھر کچھ باتیں کہنی چاہتا ہوں۔

گزشتہ خطبات میں مَیں نے مجالس خدام الاحمدیہ کے متعلق بعض باتیں کہی تھیں اور اِسی سلسلہ میں مَیں آج پھر جماعت کو اس امر کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ قومی نیکیوں کے تسلسل کے قیام کیلئے یہ ضروری ہے کہ اُس قوم کے بچوں کی تربیت ایسے ماحول اور ایسے رنگ میں ہو کہ وہ اُن اغراض اور مقاصد کو پورا کرنے کے اہل ثابت ہوں جن اغراض اور مقاصد کو لے کر وہ قوم کھڑی ہوئی ہو۔ جب تک کسی قوم کا کوئی خاص مقصد اور مدعا نہیں ہوتا اُس وقت تک اس کیلئے صرف اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ وہ اپنے نوجوانوں کو اس زمانہ کی ضرورت کے مطابق کوئی تعلیم دلا دے یا عام علوم سے واقفیت بہم پہنچا دے یا بعض پیشے انہیں سکھا دے۔ جب کوئی قوم اتنا کام کر لیتی ہے تو وہ اپنے فرض سے سبکدوش سمجھی جاتی ہے۔ لیکن جب کوئی قوم ایک خاص مقصد اور مدعا لے کر کھڑی ہوئی ہو تو اُس کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اُس مقصد اور مدعا کو

نوجوانوں کے ذہنوں میں پورے طور پر داخل کرے اور ایسے رنگ میں ان کی عادات اور خصائل کو ڈھالے کہ وہ جب بھی کوئی کام کریں خواہ عادتاً کریں یا بغیر عادت کے کریں، وہ اُس جہت کی طرف جارہے ہوں جس جہت کی طرف اس قوم کے اغراض و مقاصد اسے لئے جارہے ہوں۔ جب تک کسی قوم کے نوجوان اس رنگ میں کام نہیں کرتے اُس وقت تک اسے ترقی حاصل نہیں ہوتی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے ہیں اُس وقت عرب کا کوئی مذہب نہیں تھا اِس وجہ سے جو بات بھی آپ بیان فرماتے وہ عربوں کیلئے نئی ہوتی اور اُن میں سے ہر شخص جو مسلمان ہوتا اِس بات کو ذہن میں رکھ کر مسلمان ہوتا تھا کہ پچھلی تمام باتیں اُس نے ترک کر دینی ہیں۔ پس اُس زمانہ میں مسلمان ہونے کا مقصد اور مدعا آپ ہی آپ سامنے آجاتا تھا اور کوئی خاص زور دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی کیونکہ یکدفعہ ہر شخص یہ فیصلہ کر لیتا تھا کہ اسے اپنی گزشتہ تمام باتیں ترک کرنی پڑیں گی اور نئے مقاصد، نئی اغراض، نئی شریعت اور نئے احکام اس کے سامنے ہوں گے لیکن جب کوئی ایسا سلسلہ شروع ہو جس کی بنیاد پہلے مذہب پر ہو اور وہ خالص اصلاحی سلسلہ ہو تشریعی نہ ہو تو اس کیلئے اس مقام میں پہلی جماعتوں سے زیادہ دِقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ بعض قسم کی دِقتیں پہلی جماعت کو زیادہ ہوتی ہیں مگر اس میں بھی کوئی شُبہ نہیں کہ بعض قسم کی دِقتیں اصلاحی سلسلہ کو زیادہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ انہی دِقتوں میں سے ایک دِقّت یہ ہے کہ ایسے سلسلہ کے افراد کو اس سلسلہ کے مقاصد اور اغراض سمجھانے کیلئے جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ جب نوجوانوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ تمہارا دین کوئی نیا دین نہیں تو قدرتی طور پر ان کا ذہن یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ سوائے چند مستثنیات کے جن میں ہمارے آباء نے غلطی کی اور وہ اصل شریعت سے دُور جا پڑے ہر پچھلی چیز کو ہم نے قائم کرنا ہے۔ اس وجہ سے ان کے ذہن میں کوئی امتیازی بات نہیں آتی اور وہ اس امر کے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ ہم میں اور دوسروں میں کیا فرق ہے۔ لیکن جب نیا دین ہو یا پہلے دین کی بعض باتوں میں تغیر و تبدّل ہو تو وہ ہر قدم کے اُٹھاتے وقت یہ پوچھ لیتے ہیں کہ کیوں جی! یہ کام ہم نے اِس طرح کرنا ہے یا اس طرح؟ حضرت مسیح ناصریؑ کے زمانہ میں جب آپ کے متبعین کے دلوں میں فقیہوں اور

فریسیوں کے متعلق یہ سوال پیدا ہوا کہ ہم ان کی باتوں کو مانیں یا نہ مانیں اور اُنہوں نے حضرت مسیح ناصریؑ سے یہی سوال کیا تو چونکہ معلوم ہوتا ہے اُس زمانہ میں شریعت موسویہ میں لوگوں نے زیادہ تغیر نہیں کیا تھا، چند نئی باتیں تھیں جو حضرت مسیحؑ نے اپنے پہاڑی وعظ میں بتا دیں اِس لئے حضرت مسیح نے فرمایا:-

''فقیہہ اور فریسی موسیٰ کی گدّی پر بیٹھے ہیں۔ پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں'' [1]

گویا بدعقیدگی ان میں کم تھی اور بداعمالی زیادہ تھی۔ اسی لئے آپ نے یہ ہدایت کر دی کہ جو کچھ فقیہی اور فریسی کہتے ہیں اُس پر بے شک عمل کرو مگر ان کے اعمال کی نقل نہ کرو۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے زمانہ کی حالت اُس زمانہ سے بالکل مختلف ہے۔ اس زمانہ میں مثلاً تورات میں بہت سے تغیرات کئے جا چکے تھے مگر باوجود تغیرات کے اور باوجود تحریف و الحاق کے یہودی اِس بات پر اصرار کرتے تھے کہ ہماری کتاب محفوظ ہے مگر ہمیں ایک ایسی قوم سے واسطہ پڑا ہے جو اس کے بالکل اُلٹ چلتی ہے یعنی تورات میں تو تبدیلی ہو چکی تھی اور یہودی قوم یہ اصرار کرتی تھی کہ اس میں تبدیلی نہیں ہوئی مگر قرآن جو کہ بالکل محفوظ ہے اس کے متعلق مسلمان کہتے ہیں کہ اس کی کئی آیتیں منسوخ ہیں۔ اب یہ کتنا عظیم الشان اختلاف ہے اُس زمانہ کے یہودیوں اور اِس زمانہ کے مسلمانوں میں۔ وہ باوجود کتاب کے بگڑ جانے کے کہتے تھے کہ ہماری کتاب بالکل محفوظ ہے اور مسلمان باوجود اِس کے کہ خدا کہتا ہے کہ اِس کی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں اور اس کے ایک حرف اور ایک شعشہ کی تبدیلی بھی ناممکن ہے، مسلمان یہ کہتے ہیں کہ اس کی بہت سی آیتیں منسوخ ہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں قرآنی احکام پر عمل کرنے کا جوش باقی نہیں رہا کیونکہ انہیں خدا تعالیٰ کے کلام میں شک پیدا ہو گیا۔ اور جب کسی حکم کے متعلق شک پیدا ہو جاتا ہے تو جوشِ عمل باقی نہیں رہتا اور ہر آیت پر عمل کرتے وقت انسانی قلب میں یہ وسوسہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ممکن ہے جس آیت پر مَیں عمل کر رہا ہوں یہ منسوخ ہی ہو۔ چنانچہ پانچ آیتوں سے لے کر چھ سَو آیتوں تک منسوخ قرار دی جاتی ہیں۔ یعنی بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ قرآن کریم کی پانچ آیتیں منسوخ ہیں اور بعض نے زیادہ۔ یہاں تک کہ بعض علماء نے

منسوخ آیات کی تعداد چھ سَو تک پہنچا دی ہے۔ اب چھ سَو آیتیں قرآن مجید کا ایک معتد بہ حصہ ہیں جن کو اگر الگ کرلیا جائے تو ایک خاصہ حصہ علیحدہ ہو جاتا ہے مگر مسلمانوں کو اس امر کی کوئی پرواہ نہیں۔ اِن کی کتابوں میں یہ باتیں لکھی ہوئی ہیں اور اب تک مسلمان ان کے قائل ہیں۔ شیعہ لوگوں نے گو اس رنگ میں قرآنی آیات کو منسوخ قرار نہیں دیا مگر انہوں نے اتنا ضرور کہہ دیا ہے کہ قرآن کریم کے بعض حصے اُڑا لئے گئے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق اور اس کی صفات کے متعلق مسلمانوں میں بیسیوں غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ نہیں کہ شروع سے مسلمانوں میں یہ غلطیاں پائی جاتی تھیں بلکہ قریب کے زمانہ میں آکر مسلمانوں میں یہ غلطیاں پیدا ہوئی ہیں۔ ورنہ قرونِ اُولیٰ کا لٹریچر انہی عقائد کی تائید کرتا ہے جو آج ہماری طرف سے پیش کئے جاتے ہیں۔ سوائے اُس حصۂ قرآن کی تشریح کے جو اُس زمانہ سے تعلق نہیں رکھتا تھا بلکہ موجودہ زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ قرآن کریم کے بعض حصے ایسے ہیں جو پہلے زمانہ سے تعلق رکھتے تھے اور بعض حصے ایسے ہیں جو خصوصیت سے اِس زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ پس جو حصہ قرآن کریم کا پہلے زمانہ سے تعلق رکھتا تھا اُس میں قرونِ اُولیٰ کے صحابہ، آئمہ اور مجددین ہماری ہی تائید میں نظر آتے ہیں اور یہ تمام باتیں ان کی کتابوں میں اب تک موجود ہیں گو بدقسمتی سے مسلمان انہیں بھُول چکے ہیں۔

غرض اِس وقت نہ صرف مسلمانوں کے اعمال میں نقص ہے بلکہ ان کے عقائد اور ان کے خیالات بھی قابلِ اصلاح ہیں۔ ایسی حالت میں جب تک نوجوانوں میں بیداری پیدا نہ کی جائے اور انہیں یہ ہدایت نہ کی جائے کہ وہ اپنا قدم پھُونک پھُونک کر رکھیں اُس وقت تک ہم میں بھی بعض غلطیاں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ ہم ہمیشہ کہتے رہتے ہیں اور یہی صحیح امر ہے کہ قرآن کریم میں تبدیلی ناممکن ہے۔ ہم صرف اُن غلطیوں کو دور کرنے کیلئے کھڑے ہوئے ہیں جو مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں اور چونکہ اِس رنگ میں انسان بعض دفعہ سُست بھی ہوتا ہے اس لئے اپنے کام کی نوعیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں بہت زیادہ بیداری اور ہوشیاری کی ضرورت ہے۔

میں نے بتایا تھا کہ قوم کے نوجوانوں کے اندر اِس قسم کی بیداری اور ہوشیاری پیدا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ ہر جگہ مجلس خدام الاحمدیہ قائم کی جائے اور اِس میں ایسے نوجوان شامل کئے جائیں جو عملی رنگ میں اپنی ایسی اصلاح کرنے کیلئے تیار ہوں کہ اُن کا وجود دوسروں کیلئے نمونہ

بن جائے۔ علاوہ ازیں بعض اور بھی نقائص ہیں جو مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں اور جو زمانہ کی مخفی رَو یا ورثہ کے اثرات کے ماتحت ہماری جماعت کے بعض افراد میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ایسی مجالس کے قیام کی ایک غرض ان نقائص کو دور کرنا بھی ہوگی۔ مثلاً ہندوستانی ایک عرصہ سے غلامی کی زندگی بسر کرتے چلے آ رہے ہیں اور میں نے بارہا بتایا ہے کہ غلامی کی زندگی اپنے ساتھ بعض نہایت ہی تلخ اور ناخوشگوار نتائج لاتی ہے۔ مثلاً غلامی کی ذہنیت جن لوگوں کے اندر پیدا ہو جائے وہ کبھی کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے۔ فاتح اقوام ہمیشہ اِس کوشش میں رہتی ہیں کہ غیر حکومتوں کے مقابلہ میں ہماری تجارت اعلیٰ ہو، غیر حکومتوں کے مقابلہ میں ہماری دفاعی کوششیں مضبوط ہوں، غیر حکومتوں کے مقابلہ میں ہمارا تعلیمی معیار زیادہ بلند ہو، غیر حکومتوں کے مقابلہ میں ہماری صنعت و حرفت نہایت بلند پایہ ہو۔ اِسی طرح اور بیسیوں باتیں ہیں جو اُن کے دلوں میں جوش پیدا کرتی رہتی ہیں اور ہر سال ان باتوں پر جھگڑے رونما ہوتے رہتے ہیں جس کے نتیجہ میں قوم میں بیداری اور بلند خیالی پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر غلام قوم کے معنے یہ ہیں کہ اس کی تمام جدوجہد صرف اِس امر پر آ کر ختم ہو جاتی ہے کہ مزدوری کی اور پیٹ پال لیا یا مدرسے گئے اور تعلیم حاصل کر لی۔ بظاہر یہ ایک آرام کی زندگی نظر آتی ہے مگر دماغی لحاظ سے قتلِ عامہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ تمام قوم کا ذہن مُردہ کر دیا جاتا ہے اور وہ قوم مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کی مثال بالکل اس طوطے کی سی ہو جاتی ہے جسے کئی سال تک پنجرے میں بند رکھنے کے بعد جب آزاد کیا جاتا ہے تو وہ اِدھر اُدھر پھُدک کر پھر پنجرے میں ہی آ بیٹھتا ہے کیونکہ اُڑنے کی ہمت اس میں باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح غلام قوموں میں سُستی اور غفلت کو امن اور آرام سمجھا جاتا ہے اور اُمنگوں کا فُقدان اس قوم میں اطمینان قرار پاتا ہے۔ جب ان میں سے کوئی شخص یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ میں بڑے اطمینان کی زندگی بسر کرتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میرا دل اُمنگوں سے بالکل خالی ہے۔ اور جب وہ یہ کہتا ہے کہ دیکھو مجھے کیسا امن اور چین نصیب ہے تو اِس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر قسم کی جدوجہد اور ترقی کے راستے میرے لئے مسدود ہو چکے ہیں۔

غرض اِن عیوب اور نقائص کو دور کرنا بھی ہمارے لئے ضروری ہے کیونکہ ہمیں جو تعلیم

دی گئی ہے وہ انسانی اُمنگوں اور جذبات کو کچلتی نہیں بلکہ انہیں بڑھاتی اور ترقی دیتی ہے۔ وہ تعلیم ہمیں یہ بتاتی ہے کہ خدا نے کسی انسان کو غلام نہیں بنایا اور کوئی انسان کسی دوسرے کو غلام بنا بھی نہیں سکتا جب تک وہ خود غلام نہ بن جائے۔ اس تعلیم کے ماتحت ہمیں یہ یقین رکھنا چاہئے کہ ترقی کا جب کوئی ایک راستہ ہمارے لئے مسدود ہو جائے تو اللہ تعالیٰ بعض اَور راستے ہمارے لئے کھول دیتا ہے اور اگر ہم ان راستوں کو اختیار کریں تو بالکل ممکن ہے کہ جو آج ہم پر افسر ہیں وہ کل ہمارے غلام ہو جائیں۔ مثلاً انہی ذرائع میں سے ایک ذریعہ تبلیغ ہے یا اپنی اخلاقی برتری کا ثبوت مہیا کرنا ہے۔ دنیا میں اخلاقی برتری کے ہوتے ہوئے کبھی کوئی قوم غلام نہیں ہو سکتی۔ غلام قوم وہی ہوگی جو اخلاق میں بھی پَست ہوگی۔ ہمارے مُلک میں عام طور پر انگریزوں کو بُرا سمجھا جاتا ہے لیکن اگر اُن بعض خیالات اور عقائد کو مستثنیٰ کر کے جن میں ہمارا اور ان کا اختلاف ہے اور جن میں ہم اُنہیں غلطی پر سمجھتے ہیں، عملی رنگ میں ان کو دیکھا جائے تو ایک ہندوستانی اور انگریز میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ ایک انگریز کی کوشش، اُس کی جدوجہد، اُس کی قربانی اور اُس کا ایثار اتنا نمایاں ہوتا ہے کہ ایک ہندوستانی کی جدوجہد کی اس سے کوئی نسبت ہی نہیں ہوتی۔ وہ یورپ سے چلتے اور ہندوستان میں آ کر سالہا سال تک تبلیغ کرتے ہیں۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ یہ پادری کیا ہیں انگریزوں نے انہیں اپنے سیاسی غلبہ کے حصول کا ایک ذریعہ بنایا ہوا ہے۔ پھر اگر ان کی تبلیغ کا ذکر آئے تو وہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اجی! یہ ان کی تبلیغ اپنے فائدہ کیلئے ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ اپنے فائدہ کیلئے جو قربانیاں کرتے ہیں کیا اس قسم کی قربانیاں ایک ہندوستانی نہیں کرسکتا؟ وہ چالیس چالیس، پچاس پچاس بلکہ ساٹھ ساٹھ سال تک ہندوستان میں رہتے ہیں، یہیں بوڑھے ہوتے اور یہیں مر جاتے ہیں اور واپس جانے کا نام تک نہیں لیتے مگر ایک ہندوستانی یا تو آوارہ ہو کر گھر سے نکلے گا یا اگر آوارہ نہ ہوگا تو غیر مُلک میں جانے کے چند سال کے بعد ہی شور مچانا شروع کر دے گا کہ مجھے واپس بُلا لو۔ غرض یا تو آوارہ ہو کر گھر سے نکلتا ہے اور اگر آوارہ ہو کر گھر سے نہیں نکلتا تو غیر ممالک میں ہمیشہ بے کل رہتا اور واپسی کیلئے کوشش کرتا رہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں یورپین قومیں آوارہ ہو کر اپنے ممالک سے نہیں نکلتیں۔ وہ کام کیلئے نکلتی ہیں اور پھر جب کسی دوسرے مُلک میں اپنا کام

شروع کر دیتی ہیں تو گھبراتی نہیں اور جو تکلیف بھی انہیں برداشت کرنی پڑے اُسے خوشی سے برداشت کرتی ہیں۔ مگر یہ نتیجہ ہے اُن کی آزادی اور حُریت کا اور ہمارے آدمیوں کی سُستی اور غفلت نتیجہ ہے ان کی غلام ذہنیت کا۔ اگر یہ ذہنیت مِٹ جاتی اور وہ سمجھ لیتے کہ ترقی کا صرف ایک ہی ذریعہ نہیں ہوتا بلکہ اَور بھی بیسیوں ذرائع خدا تعالیٰ نے مقرر کئے ہوئے ہیں تو وہ سُستی اور غفلت میں مبتلا ہونے کی بجائے جدوجہد کرتے اور ایثار اور قربانی سے کام لیتے اور پھر دیکھتے کہ اس کے کیسے خوشگوار نتائج نکلتے ہیں۔ جیسے ہماری جماعت میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب ایک ایسا طبقہ پیدا ہو چکا ہے جو یہ آواز سنتے ہی کہ آؤ اور خدمتِ دین کیلئے اپنی زندگی وقف کردو نہایت خوشی اور بشاشت کے ساتھ اپنی زندگی وقف کر دیتا اور غیر ممالک میں نکل جاتا ہے۔ چنانچہ بعض تو بغیر کسی سرمایہ کے غیر ممالک میں کام کر رہے اور نہایت اچھا نمونہ دکھا رہے ہیں۔

تو مجالس خدام الاحمدیہ کے قیام کی غرض یہ ہے کہ نوجوانوں کے سامنے وہ مقاصد رکھے جائیں جن کے بغیر ان میں ارتقائی روح پیدا نہیں ہوسکتی اور جن کے بغیر جماعت کبھی بھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اِس وقت ایک ذہنی آزادی عطا کی ہوئی ہے اور وہ یہ کہ ہم میں سے ہر شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ تھوڑے عرصہ کے اندر ہی (خواہ ہم اُس وقت تک زندہ رہیں یا نہ رہیں لیکن بہرحال وہ عرصہ غیر معمولی طور پر لمبا نہیں ہوسکتا) ہمیں تمام دنیا پر نہ صرف عملی برتری حاصل ہوگی بلکہ سیاسی اور مذہبی برتری بھی حاصل ہو جائے گی۔ اب یہ خیال ایک منٹ کیلئے بھی کسی سچے احمدی کے دل میں غلامی کی روح پیدا نہیں کرسکتا۔ جب ہمارے سامنے بعض حکام آتے ہیں تو ہم اِس یقین اور وثوق کے ساتھ اُن سے ملاقات کرتے ہیں کہ کل یہ نہایت ہی عجز اور انکسار کے ساتھ ہم سے استمداد کر رہے ہوں گے۔ ہم انگریزی قوم کو عارضی طور پر مسلمانوں پر غالب دیکھتے ہیں مگر مستقل طور پر اسے اسلام کا غلام بھی دیکھ رہے ہیں۔ ہماری مثال اِس وقت ایسی ہی ہے جیسے کوئی بڑا آدمی جب کسی چھوٹے آدمی کے ہاں بطور مہمان جاتا ہے تو کچھ عرصہ کیلئے وہ اُس کے قوانین کا پابند ہوتا ہے۔ جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ خواہ کوئی کتنا بڑا آدمی ہو جب کسی دوسری جگہ جائے تو وہاں

کے امام کے تابع ہو کر رہے خواہ وہ امام چھوٹا ہی ہو۔[2] اسی طرح جب گورنر کسی دَورہ پر جاتا ہے تو گو وہ بڑا ہوتا ہے مگر ڈپٹی کمشنر کی مرضی اور اُس کے بنائے ہوئے پروگرام کے ماتحت اُسے کام کرنا پڑتا ہے۔ حضرت عمرؓ جب شام میں گئے تو حضرت ابوعبیدہؓ جو وہاں کے امیر تھے اُنہوں نے دریافت کیا کہ آپ کا پروگرام کیا ہوگا؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا یہاں میرا پروگرام نہیں بلکہ تمہارا پروگرام ہوگا اور جو کچھ تم کہو گے اُسی طرح مَیں کروں گا۔ اب حضرت عمرؓ کا اُس وقت ایک قسم کی ماتحتی قبول کر لینا یہ معنے نہیں رکھتا کہ حضرت عمرؓ نے دوسرے کی غلامی پسند کر لی۔ عمرؓ بہرحال عمرؓ تھے۔ وہ حاکم تھے، روحانی بادشاہ تھے اور خلیفۂ وقت تھے۔ حضرت ابوعبیدہؓ اُن کے تابع تھے مگر تھوڑی دیر کیلئے حضرت عمرؓ نے بھی ان کی ماتحتی اختیار کر لی۔ اِسی طرح ہم جو دُنیوی احکام کو ملتے ہیں تو اس رنگ میں ملتے ہیں کہ انہیں اِس وقت عارضی طور پر ہم پر برتری حاصل ہے مگر ہم یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ کل وہ ہمارے شاگرد ہوں گے اور ہر قسم کی ترقی کے حصول کے سبق وہ ہم سے سیکھیں گے۔ اگر اس خیال کو ہم اپنی جماعت کے افراد کے ذہنوں میں پورے طور پر زندہ رکھیں اور اسے مضبوط کرتے چلے جائیں تو ایک منٹ کیلئے بھی ہماری جماعت کے نوجوانوں کے دلوں میں غلامی کا خیال پیدا نہیں ہوسکتا۔ جیسے اُس بالا افسر کے دل میں غلامی کا خیال پیدا نہیں ہوسکتا جو تھوڑی دیر کیلئے کسی چھوٹے افسر کے ہاں جاتا اور اس کے پروگرام کا پابند ہو جاتا ہے۔

پس جماعت کے تمام دوستوں کو چاہئے کہ اپنے اپنے ہاں نوجوانوں کو منظّم کریں اور ان کی ایک مجلس بنا کر خدام الاحمدیہ اُس کا نام رکھیں اور اُنہیں سلسلہ کے وقار کے تحفظ اور اسلام اور احمدیت کی ترقی کیلئے کام کرنے کی ترغیب دیں۔

گزشتہ خطبہ میں مَیں نے اس امر کی طرف جماعت کے دوستوں کو توجہ دلائی تھی گو اتفاقی طور پر وقت زیادہ ہو جانے کی وجہ سے میں بعض باتیں بیان نہیں کرسکا تھا اور میں نے کہا تھا کہ اگلے خطبہ میں مَیں ان باتوں کو بیان کروں گا۔ اُس وقت میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگلے جمعہ کو تمام جماعتوں کے نمائندے آنے والے ہیں شاید آج اس مضمون کا کچھ حصہ رہ جانے میں یہی حکمت ہو کہ مَیں جماعت کے تمام دوستوں کو براہ راست اِس امر کی طرف توجہ دلاؤں کیونکہ

اخبار میں خطبہ کا پڑھ لینا اَور بات ہے اور زبان سے کوئی بات سننا اَور اثر رکھتا ہے۔ پس اب چونکہ تمام جماعتوں کے نمائندے یہاں آئے ہوئے ہیں اِس لئے میں ان سے خواہش کرتا ہوں کہ وہ اپنی اپنی جماعتوں میں جا کر نوجوانوں میں یہ تحریک کریں کہ وہ خدام الاحمدیہ نام کی مجالس قائم کریں۔ اِس مجلس کے قواعد مَیں تجویز کر رہا ہوں اور بعض موٹے موٹے قواعد جو میں نے بتائے تھے وہ تو غالباً مجلس خدام الاحمدیہ کے ارکان نے شائع بھی کر دیئے ہیں لیکن بہرحال تفصیلی قواعد انہیں پہنچ جائیں گے۔

اِس وقت اِس کے ایک اور حصہ کی طرف میں جماعت کے دوستوں کو بِالخصوص مرکزی مجلس خدام الاحمدیہ کو توجہ دلاتا ہوں اور وہ یہ کہ نوجوانی میں بے شک خدمتِ دین کا کام کرنا اچھا ہوتا ہے کیونکہ ادھیڑ عمر میں بعض دفعہ انسان ان کاموں کے کرنے کی ہمت کھو بیٹھتا ہے مگر اس سے بھی بڑھ کر ایک اَور کام ہے اور وہ یہ کہ بچوں کے اندر بھی یہی جذبات اور یہی خیالات پیدا کئے جائیں کیونکہ بچپن میں ہی اخلاق کی داغ بیل پڑ جاتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض کاموں کی داغ بیل جوانی میں پڑتی ہے مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ بعض کاموں کی داغ بیل بچپن میں پڑتی ہے۔ جوانی میں جن کاموں کی داغ بیل پڑتی ہے وہ بِالعموم عملی ہوتے ہیں جن کے ذریعہ انسان کا ذہن بُرے اور بھلے کی تمیز کر لیتا ہے۔ مگر قومیں صرف بُرے اور بھلے کی تمیز سے ہی ترقی نہیں کیا کرتیں بلکہ قوم کی ترقی کیلئے اچھی عادتوں کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ بے شک عادت بعض لحاظ سے نقصان رساں بھی ہوتی ہے مگر عادت درحقیقت قومی ترقی کا ایک ضروری حربہ بھی ہوتی ہے۔ کسی قوم کو نیک اخلاق کی عادت ڈال دو وہ خود بخود باقی اقوام پر غالب آنے لگ جائے گی اِسی طرح جب کسی قوم میں بد عادات پیدا ہو جائیں تو وہ خود بخود گرتی چلی جاتی ہے اور اگر اسے کسی بات کی بھی عادت نہ ڈالو تو اس قوم میں ایک تزلزل رہے گا۔ کبھی اخلاقی رَو غالب آ گئی تو وہ ترقی کر جائے گی اور اگر اخلاقی رَو دب گئی تو وہ گر جائے گی۔ تو اصل حقیقی چیز یہ ہے کہ اچھی عادت بھی ہو اور علم بھی ہو مگر یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب عادت کے زمانہ کی بھی اصلاح کی جائے اور علم کے زمانہ کی بھی اصلاح کی جائے۔ عادت کا زمانہ بچپن کا زمانہ ہوتا ہے اور علم کا زمانہ جوانی کا زمانہ ہوتا ہے۔ پس خدام الاحمدیہ کی

ایک شاخ ایسی بھی کھولی جائے جس میں پانچ چھ سال عمر کے بچوں سے لے کر ۱۵، ۱۶ سال کی عمر تک کے بچے شامل ہوسکیں۔ یا اگر کوئی اور حد بندی تجویز ہو تو اُس کے ماتحت بچوں کو شامل کیا جائے۔ بہرحال بچوں کی ایک الگ شاخ ہونی چاہئے اور ان کے الگ نگران مقرر ہونے چاہئیں مگر یہ امر مدنظر رکھنا چاہئے کہ ان بچوں کے نگران نوجوان نہ ہوں بلکہ بڑی عمر کے لوگ ہوں۔

پس خدام الاحمدیہ کو اس مقصد کے ماتحت اپنے اندر کچھ بوڑھے نوجوان بھی شامل کرنے چاہئیں یعنی ایسے لوگ جن کی عمریں گو زیادہ ہوں مگر ان کے دل جوان ہوں اور وہ خدمت دین کے لئے نہایت بشاشت اور خوشی سے کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ایسے لوگوں کے سپرد بچوں کی نگرانی کی جائے اور ان کے فرائض میں یہ امر داخل کیا جائے کہ وہ بچوں کو پنجوقتہ نمازوں میں باقاعدہ لائیں۔ سوال و جواب کے طور پر دینی اور مذہبی مسائل سمجھائیں، پریڈ کرائیں اور اسی طرح کے اَور کام ان سے لیں جن کے نتیجہ میں محنت کی عادت، سچ کی عادت اور نماز کی عادت ان میں پیدا ہو جائے۔ اگر یہ تین عادتیں ان میں پیدا کر دی جائیں تو یقیناً جوانی میں ایسے بچے بہت کار آمد اور مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

پس بچوں میں محنت کی عادت پیدا کی جائے، سچ بولنے کی عادت پیدا کی جائے اور نمازوں کی باقاعدگی کی عادت پیدا کی جائے۔ نماز کے بغیر اسلام کوئی چیز نہیں اگر کوئی قوم چاہتی ہے کہ وہ اپنی آئندہ نسلوں میں اسلامی روح قائم رکھے تو اس کا فرض ہے کہ اپنی قوم کے ہر بچہ کو نماز کی عادت ڈالے۔ اسی طرح سچ کے بغیر اخلاق درست نہیں ہو سکتے۔ جس قوم میں سچ نہیں اس قوم میں اخلاقِ فاضلہ بھی نہیں اور محنت کی عادت کے بغیر سیاست اور تمدن کوئی چیز نہیں۔ جس قوم میں محنت کی عادت نہیں اس قوم میں سیاست اور تمدن بھی نہیں۔ گویا یہ تین معیار ہیں جن کے بغیر قومی ترقی نہیں ہوتی۔

پس خدام الاحمدیہ کے ارکان کو چاہئے کہ اپنی ایک شاخ بچوں کی بھی قائم کریں مگر ان کے نگران ایسے لوگ مقرر کریں جو کم سے کم چالیس سال کے ہوں اور بہتر ہوگا اگر وہ اس سے بھی زیادہ عمر کے ہوں اور اپنے اندر ہمت اور استقلال رکھتے ہوں، ان کے سپرد یہ کام کیا جائے کہ

وہ بچوں کو اپنی نگرانی میں کھِلائیں، اُنہیں وقت ضائع کرنے سے بچائیں، نمازوں کیلئے باقاعدہ لے جائیں اور اخلاقِ فاضلہ ان میں پیدا کریں۔ اور گو تفصیلی طور پر تمام اخلاق کا پیدا کرنا ہی ضروری ہے مگر یہ تین باتیں خاص طور پر ان میں پیدا کی جائیں۔ یعنی نمازوں کی باقاعدگی کی عادت، سچ کی عادت اور محنت کی عادت۔ باقی ہمارے مُلک میں بعض اَور بھی اخلاقی خرابیاں ہیں جن کا دُور کرنا ضروری ہے۔ مثلاً ہمارے مُلک میں گالی دینے کا عام طور پر رواج ہے اور اِس میں شرم وحیا سے کام نہیں لیا جاتا۔

مجھے یاد ہے حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کو جب چوٹ لگی تو مرہم پٹی کرنے کیلئے ایک مخلص دوست مقرر تھے مگر اُن کی زبان پر بہن کی گالی بہت چڑھی ہوئی تھی۔ ایک دن جبکہ حضرت خلیفہ اول کے پاس ہم سب بیٹھے ہوئے تھے اور باہر سے بھی کچھ مہمان آئے ہوئے تھے ایک دوست نے برسبیلِ تذکرہ دریافت کیا کہ ابھی حضرت صاحب کا زخم اچھا نہیں ہوا؟ اِس پر وہ بے اختیار زخم کو بہن کی گالی دے کر کہنے لگے یہ اچھا ہونے میں آتا ہی نہیں۔ حضرت خلیفہ اوّل اُس وقت سامنے بیٹھے تھے اور باقی سب دوست بھی موجود تھے۔ اُن کے منہ سے جب اس مجلس میں یہ گالی نکلی تو ہم سب پر ایک سکتے کی حالت طاری ہوگئی مگر پھر ہم یہی سمجھ کر خاموش ہو رہے کہ ان بیچاروں کو اِس گالی کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ تو گالی دینے کی عادت ہی جب کسی شخص میں پیدا ہو جاتی ہے اُس کا مٹانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اَور کئی قسم کی بُری عادتیں ہیں جو ہمارے ملک میں لوگوں کے اندر پائی جاتی ہیں۔ اِن عادتوں کو مٹا کر ان کی جگہ اگر نیک عادتیں پیدا کر دی جائیں تو لازماً قوم کی اصلاح ہو سکتی ہے۔

پس مجلس خدام الاحمدیہ کے ارکان کا صرف یہی فرض نہیں کہ وہ نوجوانوں کی اصلاح کریں بلکہ ان کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ بچوں کی اصلاحی شاخ الگ قائم کریں اور اس کے ذریعہ جو چھوٹی عمر کے بچے ہیں اُن کی تربیت کریں۔ میں اِس کیلئے بھی اِنْشَاءَ اللّٰہ تَعَالٰی انہیں قواعد تیار کر دوں گا۔ سرِ دست جو تین باتیں میں نے بتائی ہیں ان پر انہیں عمل کرنا چاہیئے۔ یعنی بچوں میں نماز کی عادت، سچ کی عادت اور محنت کی عادت پیدا کرنی چاہیئے۔ محنت کی عادت میں آوارگی سے بچنا خود آ جاتا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہاں کی مجلس خدام الاحمدیہ بھی

اور بیرونی جماعت کی مجالس بھی اِن اصول کے ماتحت اپنے کام کو محنت سے سرانجام دیں گی اور خدمتِ خلق کے کام کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھیں گی۔

میں نے بارہا بتایا ہے کہ خدمتِ خلق کے کام میں جہاں تک ہو سکے وسعت اختیار کرنی چاہیئے اور مذہب اور قوم کی حد بندی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ہر مصیبت زدہ کی مصیبت کو دور کرنا چاہیئے خواہ وہ ہندو ہو یا عیسائی ہو یا سکھ۔ ہمارا خدا ربُّ العالمین ہے اور جس طرح اس نے ہمیں پیدا کیا ہے اُسی طرح اُس نے ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں کو بھی پیدا کیا ہے۔ پس اگر خدا ہمیں توفیق دے تو ہمیں سب کی خدمت کرنی چاہیئے۔ یہاں قادیان میں بعض مجبوریوں کی وجہ سے ہم عارضی طور پر ہندوؤں سے سَودا نہیں خریدتے مگر بیسیوں ہندو اور سکھ ہمارے پاس امداد کیلئے آتے رہتے ہیں اور ہم ہمیشہ ان کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ ایک دفعہ کانگریس کی ایک مشہور لیڈر یہاں آئیں اور انہوں نے کہا کہ یہاں کے ہندوؤں کو بہت تکلیف ہے۔ میں نے کہا میں ایسی بیسیوں مثالیں دے سکتا ہوں جب یہ ہندو میرے پاس آئے اور میں نے ان کی امداد کی اور ان پر بڑے سے بڑے احسان کئے۔ چنانچہ بعض واقعات میں نے اُنہیں بتائے بھی۔ وہ میری باتیں سُن کر حیران ہوگئیں اور کہنے لگیں یہ بات ہے میں نے کہا آپ ان سے پوچھ لیجئے کہ آیا فلاں فلاں مواقع پر میں نے ان کی مدد کی ہے یا نہیں؟ اور اب بھی میں ان کے ساتھ موقع ملنے پر حُسنِ سلوک ہی کرتا ہوں مگر انہوں نے پھر ہندوؤں سے پوچھا نہیں شاید میری بات پر ہی اعتماد کر لیا یا انہیں پوچھنے کا موقع نہ ملا۔

تو حُسنِ سلوک میں کسی مذہب کی قید نہیں ہونی چاہیئے اور جو شخص بھی اس قسم کے حُسنِ سلوک میں مذہب کی قید لگاتا اور اپنے ہم مذہبوں کی خدمت کے کام کرنا تو ضروری سمجھتا ہے مگر غیر مذہب والوں کی خدمت کرنا ضروری نہیں سمجھتا وہ اپنا نقصان آپ کرتا ہے اور دنیا میں لڑائی جھگڑے کی روح پیدا کرتا ہے۔ پھر جو تبلیغی جماعتیں ہوتی ہیں اُن کیلئے تو یہ بہت ہی ضروری ہوتا ہے کہ وہ ساری قوموں سے حُسنِ سلوک کریں اور کسی کو بھی اپنے دائرہ احسان سے باہر نہ نکالیں۔ تا تمام قومیں اُن کی مداح بنیں۔ پس وہ خدمتِ خلق کے کاموں میں مذہب وملت کے امتیاز کے بغیر حصہ لیں اور جماعت کے جو اغراض اور مقاصد ہیں اُن کو ایسی وفاداری کے

ساتھ لے کر کھڑے ہو جائیں کہ خدا تعالیٰ کے راستہ میں ان کیلئے اپنی جان قربان کر دینا کوئی دوبھر نہ ہو۔ جب کسی قوم کے نوجوانوں میں یہ روح پیدا ہو جائے کہ اپنے قومی اور مذہبی مقاصد کی تکمیل کیلئے جان دے دینا وہ بالکل آسان سمجھنے لگیں اُس وقت دنیا کی کوئی طاقت اُنہیں مار نہیں سکتی۔ جس چیز کو مارا جاسکتا ہے وہ جسم ہے مگر جس شخص کی روح ایک خاص مقصد لے کر کھڑی ہو جائے اُس روح کو کوئی فنا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ بلکہ ایسی قوم کا اگر ایک شخص مرے تو اُس کی جگہ دس پیدا ہو جاتے ہیں۔

میں ہمیشہ یہ سمجھا کرتا ہوں کہ قصے کہانیوں میں جو یہ ذکر آتا ہے کہ فلاں نے ایک دیو مارا تو اس کے خون کے قطروں سے دس دیو اَور پیدا ہو گئے، یہ ذہنی قتل کے ناممکن ہونے کو ایک تمثیل کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے اور اِس میں یہی بتایا گیا ہے کہ جب کسی قوم کے ذہن میں راسخ طور پر کوئی نیک عقیدہ پیدا ہو جائے اُس وقت اسے کوئی قتل نہیں کرسکتا۔ اور اگر اس قوم کے کسی فرد پر کوئی شخص ہاتھ اٹھاتا اور اُسے قتل کرتا ہے تو اُس کی موت ایسی شاندار ہوتی ہے کہ ہزاروں اس کے قائمقام پیدا ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں ہمیشہ یہ نظارہ نظر آیا ہے اور اب بھی یہ نظارہ نظر آسکتا ہے بشرطیکہ ہمارے نوجوان یہی روح اپنے اندر پیدا کریں۔ پھر نہ اِنہیں وطن میں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ غیر مُلک میں ان کو کوئی مٹا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ اِس روح کے نتیجہ میں وہی لوگ بن جائیں گے جن کو اِسی دنیا میں خدا تعالیٰ ایسی زندگی دے دیتا ہے جس پر موت نہیں آتی اور ایسی حیات دے دیتا ہے جس پر فنا طاری نہیں ہوتی۔

چونکہ اب نماز کے بعد مجلسِ شوریٰ کا اجلاس ہونے والا ہے اِس لئے میں خطبہ کو اِسی پر ختم کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمارے نوجوانوں کو فرض شناسی کی توفیق عطا فرمائے اور جماعت کے دوسرے افراد کے دلوں میں بھی ایسی روح پیدا کرے کہ وہ دوبارہ اُسی اسلام کو دنیا میں قائم کر کے دکھا دیں جس اسلام کو آج سے تیرہ سَو سال پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا تھا۔'' (الفضل ۲۲ ؍ اپریل ۱۹۳۸ء)

---

[۱] متی باب ۲۳ آیت ۲، ۳۔ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لنڈن ۱۸۸۷ء

[۲] مسلم کتاب المساجد باب مَنْ اَحَقُّ بِالْاِمَامَةِ